مطبوعات

اسلام کا تمدنی و سیاسی نظام

از: نکہت شاہجہاں پوری۔
شائع کردہ: کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور۔
قیمت: مجلد مع رنگین گرد پوش (۸، ۴ صفحات) ۵ روپے۔

ان موضوعات پر نئی نئی کتابوں کا مارکیٹ میں آنا بتا رہا ہے کہ ہماری ذہنی فضا میں تبدیلی آ رہی ہے اور اسلامی نظام زندگی پر لٹریچر کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

نکہت شاہجہاں پوری جانے پہچانے مصنف ہیں اور پہلے بھی انھوں نے اسلامیات پر چند کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی اس تازہ ترین تالیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی اسلام سے وابستگی خاصی گہری ہے اور اسلام و مادیت کی کشمکش کے اس فتنہ زا دور میں اسلام کی صداقت پر آپ کا ایمان قائم ہے۔ بنا بریں ہم کتاب کی خامیوں کے باوجود اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اس کتاب پر تفصیلی رائے دینے کے لئے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے، اور اس پر بہرحال وقت لگے گا۔ سر دست ہم ایک سرسری جائزہ لے کر مجملاً اظہار خیال کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

کسی بھی تمدنی و سیاسی نظام کو پیش کرنے کے لئے ایک خاص طرح کا سائنٹفک اسلوب اور ترتیب ابواب و تقسیم مباحث کا ایک خاص طرز اختیار کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جناب مولف نے "نظام اسلامی" کی سائنس کو تحقیقی طریق پر بیان کرنے کے بجائے زیادہ تر ایمانیات و معتقدات اور روحانیات کو تذکیری انداز سے بیان فرمایا ہے۔ یہ بجائے خود ایک کار خیر ہے لیکن موضوع کے تقاضے دوسرے تھے۔

مثلاً تنظیم حکومت کے ابتدائی اصول کے عنوان (ص ۲۳) کے تحت جس طرح کے مباحث کی توقع کرنی چاہیئے ان کے بجائے کچھ دوسری طرح کی اچھی باتیں درج ہیں۔ اس فصل میں جو ۱۳ اصول نمایاں کئے گئے ہیں وہ درحقیقت اسلامی نظم حکومت کے اصول نہیں ہیں۔

آیات قرآنی کے ترجمہ میں بے احتیاطی بعض جگہ بہت نمایاں ہے مثلاً "الذین ان مکنّٰھم ــــــ الآیہ کا

ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"وہی لوگ بے شبہ اس دُنیا میں صاحبِ حکومت واقتدار ہیں جو نمازیں قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں .... الخ"

حالانکہ اگر مؤلف نے خود قرآن میں اس آیت کو پورے سلسلۂ کلام کے ساتھ دیکھا ہوتا تو وہ یہ معنیٰ کبھی نہ کرتے۔ اسی طرح متعدد آیات کے ترجمے محلِ نظر ہیں۔

ایک صاحبِ نظر اس کتاب کو پڑھتے ہی یہ اندازہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ مؤلف نے اسلام کے سیاسی وتمدنی نظام کا مطالعہ اصل ماخذ سے منظم طور پر (SYSTEMATICALY) نہیں کیا ہے بلکہ منتشر طریق سے معلومات جمع کی ہیں۔ حالانکہ کتاب کا موضوع باقاعدہ ریسرچ کا متقاضی تھا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اسلام کے حق میں ہے اور تجدد پسندوں کے من گھڑت نظریات سے متصادم ہے۔ اس کا اصل مقصد اسلام کو مسخ کرنا یا اس کو مادہ پرستانہ تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا نہیں، بلکہ اس کی اصل قدروں کی ترجمانی کرنا ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔

تجدیدِ تصوف وسلوک — از: جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق استاذ فلسفہ ودینیات عثمانیہ یونیورسٹی۔
ملنے کا پتہ: مولوی سعید الباری صاحب، شبستانِ قدمِ رسول، ہارڈنگ روڈ لکھنؤ۔

قیمت: مجلد مع گردپوش سادہ (صفحات ۲۹۶) ۵ روپے۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے تصوّف کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کی حقیقت ایک خاص عقلی انداز سے کی ہے۔ اور اس سارے علمی کام میں مولانا اشرف علی مرحوم کے نقطۂ نظر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ مولانا مرحوم نے تصوف کو عجمیت کے اثرات سے پاک کرنے اور شریعت سے اس کی بے نیازی کو ختم کرنے کے لئے جیسی کچھ کوشش کی ہے وہ مولانا کی تحریروں اور اقوال کے ان تمام حوالوں سے از خود واضح ہوتی ہے جن سے فاضل مؤلف نے کتاب کو مزین کیا ہے۔ بہرحال تصوف وسلوک کی حقیقتوں کی یہ محتاط ترین تعبیر ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

تصوف کی ساری عمارت احسان کے تقاضوں پر کھڑی ہوتی ہے اور یہ وہ اصطلاح ہے جسے ایمان و اسلام کے ساتھ نبی صلعم نے خود استعمال فرمایا تھا۔ لیکن آگے چل کے احسان کے سیدھے سادے تقاضے ٹیکنیکل شکلیں اختیار کرتے کرتے کچھ کے کچھ بن گئے۔ پیشِ نظر کتاب تصوف کے پورے نظام کا تجزیہ کر کے اس کے مطابق اسلام کے اجزاء کو واضح کرنے کے لئے لکھی گئی ہے! ذوقِ تصوف رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بعض دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

جناب مؤلف اپنی کتاب میں اگرچہ تصوف کا ایک بہتر تصور دلاتے ہیں، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تاریخِ تصوف نے اپنے ساتھ بعض ایسے غیر صحیح اثرات لے لئے ہیں جن سے یہ کتاب بھی بالاتر نہ رہ سکی۔

سب سے پہلی چیز جو کھٹکتی ہے وہ شریعت اور تصوف یا فقہ ظاہر اور فقہ باطن یا علماء اور صوفیا کی تقسیم کا ایک مستقل تصور ہے جو دو شعبوں کو الگ الگ کرتا ہے، ان کے ماہرین کو دو صنفوں میں بانٹتا ہے اور ان میں علیحدگی کا احساس پیدا کرتا ہے حالانکہ خود دینِ برحق نے اپنے سہ گونہ تقاضوں (ایمان، اسلام، احسان) کو ترکیب دے کر شئے واحد کی حیثیت سے پیش کیا تھا، انبیاء نے ہمیشہ ایک ہی جامع دعوت انسانوں کے سامنے پیش کی، اور ان کی تعلیم و تزکیہ کا ایک وحدانی سسٹم اختیار کیا تھا۔

دوسری چیز وہ فراری ذہنیت ہے جو چھٹی صدی ہجری کے دورِ پُرفتن میں سیاست و تمدن کی بازی ہر کر پسپا ہونے والوں کے ساتھ خانقاہوں میں داخل ہو گئی اور تصوف کے نظام میں جب وہ رچ بس گئی تو اس نے ایمان، اسلام اور احسان سب کو انفرادی زندگی سے متعلق کر دیا۔ اس طرح جب تصوف پر دان چڑھا تو اس کی نگاہ تمدن و سیاست کے اجتماعی فساد سے بے نیاز ہو کر افراد سازی پر ایسی مرتکز ہوئی کہ نظامِ اجتماعی میں انقلاب برپا کرنے کی ذمہ داریاں بالکل پسِ پشت ڈال دی گئیں۔ اچھے سپاہی بنانے کا ٹیکنیکل پروگرام جتنا ترقی کرتا گیا وہ اصل معرکہ نگاہوں سے اتنا ہی اوجھل ہوتا گیا جس کے لئے ساری سپہ گری شروع کی گئی ہے۔ پیشِ نظر کتاب بھی بڑی حد تک اسی انفرادی تصوف کی حامل ہے۔

تیسری چیز جسے ہم نے محسوس کیا ہے وہ تصوف کے اس اجتہادی قالب، بلکہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا کا ضرورت سے بڑھا ہوا احترام ہے جسے ہم نے ایک طویل تاریخ سے ورثے میں پایا ہے۔ بیعت کا سسٹم کشف و

کرامات کا فلسفہ، مراقبوں اور تربیتِ نفس کی ورزشوں کا پروگرام، اذکار و اوراد کا ضابطہ وغیرہ فنیات جس طرح پروان چڑھ گئے ہیں، اب ان میں سے ہر چیز مقدس اور اٹل بن گئی ہے اور ہر تصوف پسند کا یہ فرض قرار پاگیا ہے وہ اس پورے ورثے کے ایک ایک جز کی قدر و قیمت قائم رکھنے کے لئے عقلی تاویلیں کرے۔ حالانکہ کتاب و سنت سے احسان کا جو اصل جوہر اور اس کے منصوص اصول حاصل ہوتے ہیں، اٹل اور مقدس صرف وہ ہیں اور ان پر جو قالب ایجاد و اختراع کی قابلیتوں کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے، ضروری نہیں کہ تاقیامت اسے شوشہ بشوشہ قائم رکھا جائے اور زمانے کے تقاضوں اور وقت کے ذہن کے پیشِ نظر اس میں کسی ترمیم کی جرأت نہ کی جائے۔ تجدیدِ تصوف و سلوک کے مباحث و مطالب بہرحال تصوف کے مروجہ اجتہادی قالب ہی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ یہ قالب اتنا بدنام ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ایسی روایات وابستہ ہو چکی ہیں کہ اس کو جہاں لے کے جائیے وہیں اس کے مخصوص اثرات ظاہر ہو کے رہیں گے۔

چوتھی چیز جس کی طرف ایک تبصرہ نگار اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، اہلِ تصوف کا وہ مخصوص اندازِ تفلسف ہے جو ہر سیدھی سادی بات کو پُرپیچ اور پُراسرار بناتا رہتا ہے۔ ہر بات میں سے نکتے نکالنا، پھر چند نکتوں کو کسی نئے نکتے سے جوڑنا، پھر ان کے مجموعے سے کوئی اور بہتر خدا برآمد کرنا، پھر اس نکتہ آفرینی کے لئے ایک شاعرانہ سی ابہامی زبان استعمال کرنا ——— کہ وہ بجائے خود مزید نکتوں کو پیدا کرتی ہے ——— اور نہایت درجہ مصنوعی پن کے ساتھ حسن نظامی صاحب کی طرح روحانیات کے محل کھڑے کرنا درحقیقت تقاضائے اسلام نہیں ہے۔ تصوف کی اس روایت کا پرتو بھی کتاب پر پڑا ہے ——— اگرچہ اس کا تناسب ایسا ہے کہ گوارا کیا جا سکے۔

پانچویں چیز اس کتاب کی زبان، اس کا اسلوب اور اس کی اصطلاحات ہیں جو تصوف کے مروجہ قالب سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ جناب مؤلف نے بلاشبہ اپنی بات کو ہمارے دماغوں کے قریب کرنے کی خاص کوشش کی ہے، لیکن ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ آج جس طبقے کو ہم تعلیم یافتہ طبقہ کہتے ہیں اس کے لئے تو بہرحال اس کتاب کو پڑھنے کی ہمت کرنا ہی مشکل ہوگا، کجا کہ وہ اس سے کچھ اپنے لئے اخذ کر سکے۔

ان چند ناقدانہ اشارات کا مدعا کتاب کی قدر و قیمت کو کم کرنا نہیں ہے، بلکہ ہم تصوف کے موضوع پر اسے ایک اہم کتاب سمجھتے ہیں۔